Oriental College Magazine, Century Number, Vol.100, No. 02-04,
Serial No. 376-378, 2025

محمد سلیم الرحمٰن کی دوستوں کے لیے نظمیں

محمد اقبال (سلیم سہیل)، پی ایچ ڈی
ایسوسی ایٹ پروفیسر اُردو
ایف.جی ڈگری کالج برائے خواتین، کھاریاں کینٹ

POEMS FOR HIS FRIENDS BY MUHAMMAD SALIM UR REHMAN

Muhammad Iqbal (Salim Suhail), PhD
Associate Professor of Urdu
F.G Degree College for Women Kharian Cantt

Abstract

M. Salim-ur-Rahman pays handsome tribute to some of his outstanding contemporary poets. Each poem consists of four couplets and an attempt has been made to reflect the sensibility of these poets. The poem about Nasir Kazmi has a subdued tragic touch. Ahmad Mushtaq's tricky simplicity is serenely conveyed. Munir Niazi's lonely and inimitable voice makes itself manifest. Zafar Iqbal's bold experiments in ghazal are commented upon with relish. A poem which is a tribute to Salahuddin Mahmood and indirectly to Mahmood Gilani (a writer of fiction), points out their originality and friendliness. The poem about Zulfiqar Tabish trenchantly portrays his troubled life and artistic excellence. Khurshid Rizvi's accomplishment as a poet has been defined with considerable clarity. These poems are a sort of critical estimation.

Keywords:
M. Salim-ur-Rahman, Nasir Kazmi, Ahmad Mushtaq, Munir Niazi, Zafar Iqbal, Salahuddin Mahmood, Mahmood Gilani, Zulfiqar Tabish, Khurshid Rizvi

ناصر کاظمی کے لیے نظم

بیسویں صدی کی اردو غزل کا تذکرہ جس شاعر کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے وہ ناصر کاظمی ہیں۔ وہ سراپا شاعر تھے۔ وہ اُن میں سے تھے جن کو خیال میں لائیں تو زندگی اور شاعری کے الفاظ ایک معنی دینا شروع کر دیتے ہیں۔ شخص اور شاعر کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ لاہور کے رتجگوں اور راستوں سے اتنا پیار کیا کہ رات اور راستہ ناصر کاظمی کی چاپ کو پہچاننے لگا۔ ڈرائیور، تانگہ بان، پنواڑی، بیرے سب ناصر کاظمی کے مزاج دان بن گئے۔ یہ اتفاقات سب کے ساتھ نہیں ہوتے۔ لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ ناصر کے ہم مجلس بننے کی طلب انھیں کھینچے لیے آئی۔ "برگ نے "۱۹۵۲ء، "دیوان "۱۹۷۲ء، "پہلی بارش" ۱۹۷۵ء، "نشاط خواب "(نظمیں)۱۹۷۷ء، "سُر کی چھایا"(منظوم ڈراما) ۱۹۸۱ء مضامین کا مجموعہ "خشک چشمے کے کنارے "۱۹۸۲ء، "ڈائری چند پریشاں اوراق" ۱۹۹۵ء جنھیں القا، ریڈنگ، لاہور نے چھاپ دیا ہے۔ اور ان کا کلیات بھی دستیاب ہے اور الگ الگ مجموعے بھی۔ وہ قاری جس نے شاعری کا مطالعہ نیا نیا شروع کیا ہو اُس کے لیے یہ کتابیں ارمغان کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس شاعری کا لہجہ دھیما ہے مگر کاٹ زیادہ۔ کاغذ پر تصویر سی بن جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ منظر جو گزر چکا تھا اسے زندہ کیا جا رہا ہو۔ سادہ، آسان زبان مگر واردات کا بیان ایسا کہ جو ثابت نہیں رہنے دیتا۔ اندر اندر یہ شاعری راستہ بناتی ہے۔ ناصر خدا کی اس دنیا میں ایسا دل لے کر آیا جو محبت اور شاعری کے لیے بنا تھا۔ ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد پیشہ ورانہ شاعری اور اصیل شاعری کا فرق ٹھیک سے سمجھ آتا ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن نے اپنے دوست ناصر کاظمی کو ان لفظوں میں سپاس نامہ پیش کیا ہے:

عمر کی فصل پک گئی ، زردیِ رُخ سے ہے عیاں
خواب میں دیکھتا ہوں میں چلتی ہوئی در انتیاں
سحر بہار میں مگن ، زاد سفر سے بے نیاز
بھول چکے قفس کے رنج اور نشاطِ آشیاں
ماہ رُخوں کو کیا خبر ، عرضِ ہُنر ہے جوئے خوں
حرف غلط ہے اِن دنوں کوہ کنوں کی داستاں
گرد و غبار اوڑھ کر ہو گئے خاکِ رہ گزر
ناصر کے سر پہ پھر بھی تھا دھوپ کا کوئی سائباں(۱)

مطلع میں عمر کے غروب کا منظر تو بہت سے شاعروں نے بیان کیا ہو گا۔ حوصلے کا کام ہے۔ اس مطلع کی وحشت بتا رہی ہے کہ اس شاعر کی زندگی کس کرب میں گزری۔ محمد سلیم الرحمٰن اپنے شعر میں وجہ

اور سب بڑا مضبوطی سے باندھتے ہیں۔ فصل اپنی پکائی پر زرد ہو جاتی ہے۔ فطرت کا قاعدہ ہے۔ اس کے بعد اس پر درانتی بھی چلتی ہے۔ یہ بھی دستور ہے۔ تلازمے میں فصل کے ساتھ عمر کو رکھ پر وابستگی میں کتنا دُکھ بھر دیا ہے۔ درانتی کا دُکھ فصل ہی جانتی ہے۔ اس جگہ خواب میں درانتیاں چلنے کا منظر ہے۔ یہ ایک بار کے لیے نہیں۔ جب تک زندگی ہے تب تک خواب ہیں اور جب تک خواب ہیں تب تک درانتیاں۔ ایک شعر میں واردات کو مکمل کرنا کیا ہوتا ہے اور پھر اس میں ایک اسرار کا التزام رکھنا اسی قبیل کے اشعار کو پڑھ کر ہوتا ہے:

سحر بہار میں مگن ، زاد سفر سے بے نیاز
بھول چکے قفس کے رنج اور نشاطِ آشیاں

اس شعر میں شاعر کی زندگی، ناصر کاظمی کی زندگی کا پورا وظیفہ در آیا ہے۔ جو لوگ کسی بھی دُھن میں مگن ہوتے ہیں۔ ان کے لیے زاد سفر بے معنی چیز ہوتی ہے۔ سحر بہار میں راستے کی تکلیفوں کو تج کر دنیاوی مصائب و آلام اور آسائشات کو بھول کر چلتے رہتے ہیں۔ گھاس کے ہرے سمندروں میں کاگے کی آواز، چڑیوں کا بولنا، پیلے پھولوں کی رُت کو دیکھنا، چاندنی کی تھکی ہوئی آواز کو سننا اُن کے شوق نرالے ہوتے ہیں جن کی حیثیت ہر چیز کو مادی ترازو میں تولنے والوں کے لیے تو بھلے نہ ہو لیکن شاعر کے لیے وہی اس کی دنیا ہوتی ہے اور اسی میں وہ عافیت محسوس کرتا ہے:

ماہ رخوں کو کیا خبر ، عرض ہُنر ہے جُوئے خوں
حرفِ غلط ہے ان دنوں کوہ کنوں کی داستاں

ماہ رُخ جن کو اشعار میں خراج تحسین پیش کرتے کرتے ہنر ور ماضی کی داستانیں بن گئے بالکل بھی نہیں جانتے کہ ایک ایک شعر تراشتے کیا کیا جوکھم جھیلے۔ ماہ رخوں کی ادائیں شاعر کے لیے کتنی بجلیاں لاتی ہیں یہ محبت کرنے والا ہی جانتا ہے۔ ماہ رُخوں کے ستم کیسے جگر چھلنی کرتے ہیں اس کا بیان کتنی پرتوں میں ڈھل کر کاغذ کا حصہ بنا ہے۔ جوئے خوں نکالنے کے مترادف ہے یہ سب کچھ مگر اس کا صلہ کچھ بھی نہیں۔ حرف غلط کی طرح بھلا دیا جاتا ہے۔ کوہ کن فرہاد ہو یا کوئی اور اکیسویں صدی زر کی چمک میں ان قصوں کو ماضی کا قصہ سمجھ کر بھلا چکی ہے۔ وہ زر کی بات کرتی ہے اور ہنر کو بے مول متاع جانتی ہے۔ اسے خبر نہیں کہ اس بے مول متاع کے حصول کے لیے کوئی کتنا رُلا ہے۔ شہر شہر، قریہ قریہ اپنے خوابوں کی کرچیوں کو جوڑتا پھرا ہے تب جا کر تصویر کی کوئی نکڑ بنی ہے۔ وہ کونا جس تصویر میں کسی کا محبوب مسکرا رہا ہو۔ غرض ہنر بلاشبہ کوہ کنی ہی تو ہے:

گرد و غبار اوڑھ کر ہو گئے خاک رہ گزر
ناصر کے سر پہ پھر بھی تھا دھوپ کا کوئی سائباں

اس مقطع میں ناصر کے ایک شعر کے ایک مصرعے میں تحریف کی گئی ہے:

خمارِ غریبی میں بے غم گزرتی ہے ناصر
درختوں سے بڑھ کر مجھے دھوپ کا سائباں ہے(۲)

شاعر کا یہ دوست اسے انیس سو بہتر میں چھوڑ گیا۔ اس کے بعد جو گزری وہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک وقت جب دوست کے ساتھ گاہ گاہ ملنا اور ایک یہ وقت کہ وہ مومن پورہ کے قبرستان میں ہے اور انتظار حسین، منیر نیازی، محمد سلیم الرحمٰن، احمد مشتاق، ریاض احمد، سہیل احمد خاں اور دوسرے کئی احباب لاہور کی گلیوں میں سالوں اسے ڈھونڈتے پھرے۔ انتظار حسین، منیر نیازی، سہیل احمد خاں تو دوست کے پاس چلے گئے۔ ان کے زندہ دوستوں کو اللہ سلامت رکھے۔ ان کی آنکھوں اور باتوں میں ناصر بولتا اور چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ مقطع میں اپنی تنہائی بے بسی، بے کلی کو بیان کیا ہے اور اس میں ناصر کی یاد ناصر کے وقت میں تو درخت تھے جسے رائیونڈ کے جمہوری حکمرانوں نے چن چن کر کٹوا دیا۔ اب وہ لاہور نہیں۔ اب خاک ہے اور دردمندوں کا سینہ چاک ہے۔

احمد مشتاق کے لیے نظم

ہم میں سے ہر انسان کے جسم میں دل ہے لیکن دلِ مشتاق نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر انسان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن منظر شناس آنکھیں نہیں۔ ہمارا دل، دلِ مشتاق ہو سکتا تھا ہماری آنکھیں منظر شناس بن سکتی تھیں مگر ہم نے ان بے مثال نعمتوں کو جلد بازی کی نظر کر دیا۔ ہم دل کی موجودگی میں بے دل ہیں اور آنکھ کے ہوتے ہوئے بے بصر۔ خدا کی ایک ہی دفعہ دی ہوئی زندگی کو مل جل کر جس طرح ہم نے ان گنت خواہشات کے آرے میں کاٹا ہے اس کا انتقام ایک دن فطرت ہم سے لے گی اور لے رہی ہے۔ اچھے ہیں وہ لوگ، اچھے ہیں وہ شاعر، اچھے ہیں احمد مشتاق جو اس دوڑ میں شامل نہ ہوئے۔ خود کو الگ کر لیا اور اپنی ذات کو فطرت کے سپرد کر دیا۔ اپنی آنکھوں کو منظروں کی نذر کر دیا اور اب آسمان، زمین، درخت، ستارے، بادل، بارش، رنگ، پرندے، محبوب، محب، دل، آنکھیں الگ الگ نہیں بلکہ اکائی میں ڈھل چکی ہیں اور احمد مشتاق کا قلم ان کی تصویریں بنا بنا کر زندگی جو خیر کی داستان ہے، کے حسن میں اضافہ کر رہا ہے۔ شاعر کا کام کائنات

میں موجود حُسن کی تسخیر کے علاوہ نہیں ہوتا۔ معیشت، سیاست، صحافت، ٹیکنالوجی کی بہتری کے لیے الگ الگ شعبے قائم ہیں اور ہمیں ان کی صلاحیتوں پر اعتماد کرنا چاہیے۔ احمد مشتاق نے اپنے دماغ سے زیادہ دل کی مدد سے دنیا کو سمجھا اور اب ان کا دل اور دنیا ایک ہو گئے ہیں۔ آنکھیں جسم بن گئیں ہیں اور خواب وسیلہ ظفر: محمد سلیم الرحمٰن نے احمد مشتاق کو کچھ پھول پیش کیے ہیں آپ بھی پڑھیں:

نیند کا جو بھی در کھلا دیکھا
اوٹ میں خواب ہی چھپا دیکھا
شور سنتے تھے کوچہ دل کا
بارے وہ بھی اُجاڑ جا دیکھا
یاد آئی کوئی پرانی بھوک
پھر سے ہنستا ہوا توا دیکھا
اپنا مشتاق کب زمانہ تھا
کر لیا حال تو نے کیا، دیکھا(۳)

مطلع سے ہی احمد مشتاق کے حسی سروکاروں کا پتا چل رہا ہے۔ نظر آ رہا ہے کہ اس شاعر نے آنکھیں محض سونے اور جاگنے کی ذمہ داری کے لیے نہیں حاصل کیں بلکہ ان میں خواب کا بیج لگایا اور اس درخت پر کھلنے والے پھولوں، بیٹھنے والے پرندوں کو سنا۔ ان آوازوں سے اپنے قلب کی تالیف کی۔ اور اپنی شاعری میں حسن پیدا کیا۔ جس طرح خواب کسی کی مرضی کے تابع نہیں ہوتے اور بڑی سے بڑی آمریت بھی خواب دیکھنے پر پابندی نہیں لگا سکتی اسی طرح احمد مشتاق نے اپنی شاعری کو اپنی اطاعت میں نہیں دیا۔ مروج شاعرانہ انداز نہیں اختیار کیا کہ کان میں قلم رکھ کر خیال کے تعاقب میں چھانٹا پکڑ کر آ نکلنے لگ جاؤ۔ شاعری کے دربار میں یہ بدعت ہے اور صالحین ایسا نہیں کرتے یہاں آنکھیں ہیں، خواب ہیں، نیند کا عمل ہے۔ اس تثلیث میں جتنا سکون ہے اسی سے احمد مشتاق کی غزل کا آموختہ اٹھایا گیا ہے۔

شور سنتے تھے کوچہ دل کا
بارے وہ بھی اجاڑ جا دیکھا

یہاں اس شعر میں آتش کا فیض سامنے کی بات ہے مگر اس کا مضمون بھی احمد مشتاق کی غزل کی تفہیم سے علاقہ رکھتا ہے۔ اُداس اور اجاڑ رہنے کی ذمہ داری خدا نے ہر دل پر نہیں ڈالی۔ نہ ہر دل یہ بار امانت اٹھا سکتا ہے۔ اس کے لیے خدا نے شاعروں کے دل چنے ہیں اور انھوں نے اس نعمت کی ناشکری نہیں کی۔

اپنے سینے سے لگایا اور اداسی سے اپنے دل کو آباد کیا۔ آتش کے ہاں قطرہ خون اور یہاں اجاڑ جا۔ شور کے ساتھ اجاڑ کا تضاد بڑا اعقلی لگ رہا ہے۔ آتش نے دل کو قطرہ خوں کہہ کر شور کی کیفیت کی اصل بیان کی ہے۔ مگر یہاں دل کے محل میں شور کے اُلٹ اُجاڑ پن بھلا بھلا لگ رہا ہے۔ یہاں بیان غم کا ہے۔ اور غم دل کے زندہ ہونے کی علامت بھی ہوتا ہے۔ اس شعر کی مدد سے احمد مشتاق کے شاعرانہ علاقے کا احاطہ عمدگی سے ہو رہا ہے۔ پتا چل رہا ہے کہ اس دل پر غم کی حکم رانی ہے اور شاعر نے سلطنت کے اس حصے میں قیام کو ترجیحی بنیادوں پر رکھا ہے:

یاد آئی کوئی پرانی بھوک
پھر سے ہنستا ہوا توا دیکھا

اس شعر میں دوست کو ایک ایسی خوشی سے متعارف کرایا جا رہا ہے جس کا تعلق گزرے ہوئے زمانے کے ساتھ ہے۔ اس میں بھوک کا لفظ حقیقی معانی میں استعمال نہیں ہوا۔ اس بھوک کا تعلق ایک عمل کے ساتھ ہے اور وہ عمل ہے کہ جب روٹیاں بنانے کے بعد آگ پر سے توا اُتارا جاتا تھا تو اُس کو اُلٹا رکھا جاتا تھا تب توے کے پیندے پر دھواں کا جل بنا دیتا تھا اور اس کاجل میں سے چنگاریاں نکل رہی ہوتی تھیں۔ اُن چنگاریوں کے ساتھ ایک خوش خیالی وابستہ تھی اور کہا جاتا تھا کہ توا ہنس رہا ہے۔ وہ اس طمانیت کا اظہار کر رہا ہے کہ میں بھوک مٹاتا ہوں۔ اب کہاں توے پر روٹی بننے کا مشاہدہ کرنے والے لوگ۔ وہ زمانے لد گئے جب توے پر ماں یا بہن یا کوئی فرد روٹیاں بنا رہا ہوتا اور خاندان گرد بیٹھتا۔ محمد سلیم الرحمٰن نے احمد مشتاق کو اپنی اس خوشی میں شامل کیا ہے جو اسے حاصل تھی۔ دوستی نام ہی اس وقت کو یاد کرنے کا ہے جب ہم دمی حاصل تھی۔ اب نیا دور ہے۔ پرانی باتوں کو گلے سے لگا کر رکھنے والے کم ہیں۔ محمد سلیم الرحمٰن نے اپنے دوست کو اپنی یاد سے خوش کرنے کی سعی کی ہے۔

اپنا مشتاق کب زمانہ تھا
کر لیا حال تو نے کیا، دیکھا

اب دو دوستوں کی آپس کی بات ہے۔ جیسے ایک دوست دوسرے کو کہہ رہا ہے۔ یہاں اس دنیا میں شاعروں کی نہیں تاجروں کی ضرورت ہے۔ مشتاق چو مکھا لفظ ہے یہاں۔ ایک احمد مشتاق دوسرا یہ کہ زمانہ خود اپنا نہیں تیرا میرا کیسے ہو گیا۔ لوگوں کو خود سے محبت نہیں۔ جو اپنا مشتاق نہیں وہ دوسرے کا نہیں ہو

سکتا۔ اے میرے دوست ہر وقت اس کی فکر میں گھل کر اپنے حال سے بے خبر نہ رہا کرو۔ یہ لوگ بات نہیں سنتے۔ دوست کڑھا نہ کرو۔ تمھارا حال مجھے عزیز ہے کیوں کہ تم انسان کی فلاح کا خواب دیکھتے ہو۔

منیر نیازی کے لیے نظم

کچھ ناموں میں پتا نہیں ایسا کیا اسرار ہوتا ہے کہ جب وہ سماعت میں آتے ہیں تو انسان کے دل میں، دماغ میں ایک دَم روشنی سے بھر جاتی ہے۔ اس شخصیت سے وابستہ یادوں کا یوم نشور ذہن کی سمتیں بدل دیتا ہے۔ آدمی جیسے ایک دم کسی کے حصار میں آگیا ہو۔ پتا نہیں اس خیال کی تحلیل نفسی کی جائے تو اس کے کیا نتائج آئیں۔ البتہ ان ناموں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ایک لمحے میں اپنے حصے کی زندگی کے غم اور خوشی، آس نراس، ہجر وصال غرض بہت کچھ دوسرے کی زندگی کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ اس بات کا امکان یقیناً ہر آدمی کے ساتھ ممکن نہیں اور ایسا ہر ایک کے ساتھ ہوتا بھی نہیں اور ہو بھی نہیں سکتا لیکن اپنے ساتھ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ منیر نیازی کا نام آتے ہی خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت ذہن پر دستک دیتی ہے اور دل منیر کی طرف چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ زبان پر "خزاں زدہ باغ پر بوندا باندی" کی قرات رواں ہو جاتی ہے اور وہ مشہور فلمی گیت "جس نے میرے دل کو درد دیا / اس شکل کو میں نے بھلایا نہیں" یا "زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا / دنیا میں خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا"۔ وجود میں یہ کلام سنسنی سی پیدا کر دیتا ہے۔ ذرا وقت گزرے تو "بے چین بہت پھرنا گھبرائے ہوئے رہنا" کی ایسی درد کی ٹیس محسوس ہوتی ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ "نظمیں" میں منیر نیازی کے لیے محمد سلیم الرحمٰن کی نظم دیکھی تو ایسا لگا جیسے بہار کی ہوا میں کوئی کسی کو یاد کر رہا ہو:

بس اک خیال کہ ہے کون جس کو دیکھا تھا
کسی وصال میں لرزاں جو آ سمایا تھا
مزاج یار کی تہ تک پہنچ سکا نہ کوئی
ستم میں جس کے بھلائی کا شائبہ سا تھا
سوادِ موسمِ گُل میں یہ سبز راہِ سفر
قدم قدم پہ تری خلوتوں کا دھوکا تھا
ہو بام و در یا دریچہ یا کوئی راہ گزر
شب ملال میں ماہ منیر تنہا تھا(۴)

مطلع میں اُس مرکز مائل طاقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کے طواف میں کسی نے اپنی زندگی بتا دی۔ منیر نیازی نے اپنے خیال کی چاپ کو اس دھیان سے محسوس کیا کہ اور کچھ سننے کی طلب دل سے جاتی رہی۔ زندگی کا اگر کوئی دوسرا نام ہوتا تو یاد ہوتا یا پھر خیال ہوتا۔ بعض گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں کہ کوئی خیال میں ایسے آن بیٹھتا ہے کہ باقی دنیا کے بٹھانے کے لیے جگہ کم پڑ جاتی ہے۔ مطلع میں خواب کی سی کیفیت ہے۔ آنکھ کے آگے سایا سا لہرا رہا ہے جس کی شبیہہ کو مکمل کرتے کرتے منیر نیازی کی زندگی مکمل ہو گئی۔ اور خیال ہی ایسا وسیلہ ہے جو آن کے لیے ہی سہی لمحے کو گرفت میں لا سکتا ہے۔ ایک ٹی وی انٹرویو میں ناصر کاظمی نے کہا تھا کہ مجھے شاعری کچھ اس لیے بھی اچھی لگتی ہے کہ اس میں کسی سطح پر ہی سہی گیا وقت واپس آ سکتا ہے۔ مطلع میں شاعر نے خیال کی دُھن میں زندگی گزاری ہے اور کسی کی یاد کے چرخے پر جو سُوت کاتا ہے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

مزاج یار کی تہ تک پہنچ سکا نہ کوئی
ستم میں جس کے بھلائی کا شائبہ سا تھا

ہم دیکھ رہے ہیں کہ مطلع میں بھی اور دوسرے شعر میں بھی کسی بات میں حتمیت نہیں۔ کون جس کو دیکھا تھا۔ بھلائی کا شائبہ سا تھا۔ یہی تو شاعری ہے۔ ریاضی کا سوال ہوتا تو دوٹوک اچھا لگتا ہے۔ یہاں منیر نیازی کا سراپا ہے جو امکان کی الگ دنیا لیے ہوئے تھے۔ پہلے مصرع میں مزاج یار کی تہہ تک نہ پہنچنے کی نارسائی ہے مگر ساتھ میں خراج بھی ہے۔ مزاج یار کی تہہ تک اگر کوئی پہنچ جائے تو وہ تو خود یار بن بیٹھے گا۔ لہٰذا یار کا مزاج یار جانتا ہے اور دوست کے ستم میں بھی مروت چھپی ہوتی ہے۔ بس ذرا پہچاننے کی ضرورتی ہوتی ہے۔ منیر نیازی جیسے انسان دنیا کے لیے ورق ناخواندہ کی طرح ہوتے ہیں۔ مگر کیا ہے کہ لوگوں کو کاروبار زرگری سے فرصت ملے تو انھیں بھی دیکھیں۔ گرمی رفتار کی ماری دنیا کے پاس اب وقت ہی نہیں کہ دوسرے کی دنیا میں جھانک سکے۔ نئی دنیا کے نئے دکھ ہیں۔ ایسے میں منیر نیازی جیسے لوگ جن کے عمل میں شر نہیں ہوتا لوگوں کے لیے اجنبی ہوتے ہیں:

سواد موسم گل میں یہ سبز راہِ سفر
قدم قدم پہ تری خلوتوں کا دھوکا تھا

اس نظم کا پورا مزاج منیر نیازی کی نظم سے ملتا ہے۔ دوست، دوست کا چہرہ ہوتا ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن نے اپنے رنگ کو تج کر منیر کا رنگ اختیار کیا ہے اور رنگ کی یہ کیفیت سارے دوستوں کے لیے لکھی

ہوئی نظموں میں ہے۔ جس کا جیسا اسلوب اس کے لیے وہی لہجہ۔ اس نظم کا علم الکلام بھی منیر نیازی کے کلام جیسا ہے۔ خیال، وصال، لرزاں، سواد موسم گل، سبز راہِ سفر، خلوتوں، بام و در دریچہ، شبِ ملال غرض منیر کے رنگوں والے بستے سے محمد سلیم الرحمٰن نے رنگ چُنے ہیں جن سے یہ نظم منور ہو گئی ہے۔ پاکیزگی روشنی ہی تو ہوتی ہے۔ یہاں جس منظر کو احساس کا حصہ بنایا گیا ہے اس میں سوادِ موسمِ گل ہے اور اس میں کوئی ہریالی میں سے گزر رہا ہے اور قدم قدم پر کسی کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ پھولوں کا موسم ہر طرف ہریاول اور یاد کی پھانس۔ دل میں کئی کہانیوں کی یاد دلا دیتی ہے۔ اپنے سے جدا ہونا آسان نہیں ہوتا۔ دم دم یاد آتی ہے اور یاد کی چرخی خیال کا حصہ بن جاتی ہے۔ ایک تلاش میں زندگی گزر جاتی ہے چہروں میں ایک چہرے کی کمی کھائے رکھتی ہے:

ہو بام و در یا دریچہ یا کوئی راہ گزر
شب ملال میں ماہ منیر تنہا تھا

چاند کا کام روشنی کرنا ہوتا ہے۔ اس جگہ شب ملال کی ترکیب حزنیہ ہے۔ حُزن بھی ہے اور ماہِ منیر کی ترکیب اس حُزن کو خوشی میں بھی بدل رہی ہے۔ دروازے، چھتیں، صحن، راستہ غرض کوئی جگہ ہو یاد کے مسافروں کے لیے ڈھنڈار بَن ہی ہوتا ہے اور اس میں اپنے وجود سے روشنی بکھیرتے رہتے ہیں۔ منیر کے کلام میں روشنی ہے۔ یہ کلام مادیت پر روحانیت کی برتری کی نوید ہے۔

ظفر اقبال کے لیے نظم

جس طرح زندگی گزارنے کے بے شمار طریقے ہیں اسی طرح شاعری کرنے کے بے حساب اسلوب ہیں۔ نہ زندگی گزارنے کے طریقوں کا کوئی ایک رجسٹر مرتب کیا جا سکتا ہے اور نہ شعر لکھنے کے لیے کوئی ایک ہدایت نامہ۔ یہ انسان اپنے بھیتر میں کائنات اصغر لیے پھرتا ہے۔ زندگی ہر آن بدلتی ہے۔ پل سے پل نہیں ملتا۔ ایسے میں انسانوں کو اپنی شرطوں جینے پر مجبور کرنا (آسمانی کتابوں کو نکال کر) دانائی سے خارج بات ہے۔ جو لوگ یہ رمز پا جاتے ہیں ان کی زندگی اور اگر وہ شاعر ہیں تو ان کی شاعری بہتی ہوا کی سی ہو جاتی ہے۔ ایک اُڑتی پتنگ جو آسمانوں کے رازوں کی رازداں ہوتی ہے۔ مگر یہ ہمت کم لوگوں میں ہوتی ہے جو اپنے بِرتے زندگی کی بازی لگاتے ہیں۔ اپنی سنتے ہیں اور خود کو ہی سناتے ہیں۔ ظفر اقبال بھی اسی قبیل کے شاعر ہیں جنھوں نے ساری زندگی اپنے آپ سے سیکھا اور اب یہ مختلف طرز شاعری راسخ حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

آسودگی کی مانند جو لمحہ بھر کے لیے بھی نصیب ہو جائے تو بڑی بات ہوتی ہے اور اس شاعر کے پاس سکون کا لمحہ نہیں بلکہ کئی گھڑیاں ہیں۔ ظفر اقبال کی شاعری کو اگر تاش کے پتوں کی مدد سے سمجھا جائے تو اس میں دُکی بھی موجود ہے اور اکا بھی۔ اس درمیان ہندسوں کو خوب ادل بدل کر اس شاعر نے کاغذ پر حسن پیدا کیا ہے۔ لاحاصلی کی آرتی اُتاری ہے۔ تاش کو خوب پھینٹ کر بازی کھیلی ہے۔ باطن میں یہ ڈر ہوگا کہ فکس کھیل اچھا نہیں ہوتا۔ ظفر اقبال کے زندگی بھر کے لکھے جوکھے کے لیے ان کے ہم دم دیرینہ محمد سلیم الرحمٰن نے غزل کے چار شعروں میں اس طرح بیان کیا ہے:

جو بھی اُفتادہ تھا سیدھا ہوا اُلٹا ہو کر
مصرع ترکو بصد شوق کیا زیر و زبر
تھی تغزل کی سبھی عشوہ گری زیرِ نقاب
جا ہی پہنچی ہے کسی ڈھب سے وہاں تک بھی نظر
اُس نے کھولا ہے ورق جب سے زبانِ نَو کا
کچھ پڑا تو ہے سیاقِ رُخِ جاناں پہ اثر
ساحلِ شعر پہ چلتی ہے تغیر کی ہوا
جس میں یلغارِ فسانہ و فسوں موجِ ظفر(۵)

مطلع ظفر اقبالی غزل کی کلید ہے۔ یہاں دونوں مصرعوں میں ظفر اقبال کے فنی حربوں کو بیان کیا گیا ہے۔ تضاد کا سہارا بھی جان دار ہے۔ اُلٹا، سیدھا، زیر، زبر۔ شاعری لفظوں کا کھیل ہی تو ہے۔ عدم کی طرف جاتا ہوا راستہ۔ یہاں افتادہ کا لفظ بنیادی لفظ ہے۔ افتادہ کا معنی ہے بنجر، گرا پڑا۔ بنجر زمین کو آباد کرنے کا سلیقہ ہر کسان کے پاس نہیں ہوتا۔ مگر جو زیرک ہوتے ہیں وہ اونے پونے خرید کر اپنی کمال ذہانت سے زمین کو زرخیز بنا لیتے ہیں۔ ظفر اقبال نے بھی یہی کیا۔ اردو شاعری کے اسالیب کو جانا اور پھر اپنے لیے آباد کرنے کے لیے وہ علاقہ چنا جو عرصے سے ہل جوتنے کا تقاضا کر رہا تھا۔ یعنی جینے کے، شعر کہنے کے نروئے طریقوں کا متلاشی تھا۔ اللہ جانے یہ بات ان کے من میں خود سے آگئی یا حضرت سلیم احمد کی غزلوں کا فیض ہے جو ساٹھ کی دہائی میں ادب لطیف میں چھپتی تھیں۔ جن میں سے ایک کا مطلع تھا:

مزاجِ حسن ہے ظاہر میں ٹھنڈا
سلگتا ہے مگر بھوبھل میں کنڈا

وفا سیتی رہے گی غم کو کب تک
کہ گندا ہو چکا ہے اب یہ انڈا
انھیں تاکا ہے میری تشنگی نے
کہ اس پیالے کا پانی ہو گا ٹھنڈا
کہیں دنیا بدلنے سے رکی ہے
گھماتے ہی رہیں گے آپ ڈنڈا
بنامِ نسخۂ اصلاحِ قومی
حکومت بھی کرے تعویذ گنڈا
کوئی تو نفسِ امّارہ کو ٹوکے
کہ حد سے بڑھ چلا ہے اب یہ سنڈا
محبت نے سیہ خانہ میں دل کے
جلا کر رکھ دیا ہے غم کا ہنڈا(۶)

اس کے بعد ظفر اقبال اس راستے پر چل پڑے اور آج راستے کے ساتھ ساتھ منزل بھی اپنے نام کر لی۔ عطا، توفیق اور ریاضت کی بات ہے ورنہ تو یہ غزل کتنے ہی لوگوں نے پڑھی ہو گی اور اگر وہ چاہتے تو اس تنوع سے اپنی شاعری میں نئی سمتیں تلاش کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہ کیا۔

فن میں اجارہ تو ہوتا نہیں۔ اور اگر کوئی یہاں بھی ایسے سوچتا ہے تو اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ ظفر اقبال نے شعر کی زمین میں نرالا بیج بویا۔ جگہیں بدلیں۔ کہیں کہیں ہریالی ملی اور کہیں کہیں بنجر پن۔ خیر تھکے نہیں۔ مصرع سازی کے شوق میں طاقت اور ناتوانی کے ذائقوں سے آشنائی حاصل کرتے کرتے عمر کی نقدی خرچ کر دی:

تھی تغزل کی سبھی عشوہ گری زیرِ نقاب
جا ہی پہنچی ہے کسی ڈھب سے وہاں تک بھی نظر

نقاب کا اپنا اسرار ہوتا ہے۔ غزل کے بنیادی شعور کے بغیر اس فن میں عشوہ گری دکھانا ٹامک ٹوئیاں مارنے کے برابر ہے۔ "آبِ رواں" اور "گلافتاب" کی شاعری اور پھر "رطب و یابس" کے بعد کی شاعری غزل کی دونوں شکلوں بلکہ بے شمار شکلوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ ظفر اقبال دایاں بھی جانتا ہے بایاں بھی۔ دائیں ہاتھ سے بھی کھیلتا ہے اور بائیں ہاتھ سے بھی۔ ایسے میں ہر گیند باز کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آتا۔ گیند باز یہاں نقاد مراد ہے۔ ذرا توجہ دیں تو اس شاعری میں کہیں زیریں سطح پر غزل کی روایت اور اسالیب اپنی موجودگی کا احساس دلاتے نظر آتے ہیں:

اس نے کھولا ہے ورق جب سے زبانِ نَو کا
کچھ پڑا تو ہے سیاقِ رخ جاناں پہ اثر

شاعری کے لیے محمد سلیم الرحمٰن نے کتنی اچھی ترکیب استعمال کی۔ سیاقِ رخِ جاناں۔ یہ غزل بھی ہو سکتی ہے محبوب کا چہرہ بھی ہو سکتا ہے۔ غرض وسیع معنوں میں یہاں آیا ہے۔ نئی زبان میں بننے اور بگڑنے کے برابر مواقع ہوتے ہیں۔ کہیں بن گیا۔ کہیں بگڑ گیا۔ اثر دونوں صورتوں میں پڑتا ہے۔ اثبات میں بھی اور نفی میں بھی۔ مگر زبانِ نو کی طرف ملتفت ہونا حوصلہ مندی کی بات ہے۔ یہ جگرا ہر کسی کا نہیں ہوتا۔ اور محمد سلیم الرحمٰن نے اس حسیت کو عمدگی سے پرکھا ہے:

ساحلِ شعر پہ چلتی ہے تغیر کی ہوا
جس میں یلغار فسانہ و فسوں موجِ ظفر

ساحل شعر بھی کیسا ساحل ہے جس میں ہزار سال کی غزل کی روایت ٹھاٹھیں مار رہی ہے اگر اس میں تغیر کا شمّہ بھی آ جائے تو بہت ہے مگر محمد سلیم الرحمٰن کے اس دوست نے ایسی ہوا چلائی ہے جو یلغار کی مانند ہے۔ اس یلغار میں افسانہ بھی ہے اور فسوں بھی۔ یہ لہر خس و خاشاک بھی رکھتی ہے اور صدف ریزے بھی۔ کلیات کی غالباً چھ جلدوں کی کمک ساتھ میں ہے۔ غلیل سے لے کر ٹینک تک ہتھیار موجود ہے۔ ایسے سامانِ حرب کے حامل لشکروں کو پسپا کم ہی ہوتے دیکھا ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن اور ریاض احمد کا یہ دوست اقلیم شعر کا فاتح ہے۔ صلاح الدین محمود اور محمود گیلانی کے لیے نظم:

جس کا ہو سراپا آپ محمود
کیا شعر میں کیجے اس کو محدود
گو پیشِ نگاہ نیش یا نوش
تھا جُود و کرم سدا سے مقصود
ہر شوقِ سفر تھا ماورائی
نہ خوفِ زیاں نہ مستیِ سُود
وہ لحن کہ روشنی کی رَو تھا
جو یاد ہے سو ہے جاوداں رُود(۷)

یہ نظم محمد سلیم الرحمٰن کے دو دوستوں صلاح الدین محمود اور محمود گیلانی کے بارے میں ہے۔

صلاح الدین محمود اور محمود گیلانی میں یہ بات مشترک تھی کہ دونوں نے اظہارِ خیال کے لیے جو پیرائے منتخب کیے تھے وہ منفرد تھے۔ صلاح الدین محمود نے جس طرح کی شاعری کی، اور جن الفاظ کو شاعری میں برتا، اس کی مثال کسی اور ہم عصر کے کلام میں نہیں ملتی۔ بطور شاعر وہ کسی سمجھوتے کے قائل نہیں تھے۔

Oriental College Magazine, Century Number, Vol.100, No. 02-04, Serial No. 376-378, 2025

اور انھیں پروا بھی نہیں تھے کہ کتنے لوگ ان کے مفہوم تک رسائی کی اہلیت رکھتے ہیں۔ نثر لکھنے کا انداز بھی انوکھا اور چونکار دینے والا تھا۔ دلچسپیاں بھی متنوع تھیں: مصوری، موسیقی، تصوف، خفیہ علوم، کرکٹ اور نہ جانے کیا کیا۔

محمود گیلانی نے بطور افسانہ نگار جو موضوعات چنے وہ بہت نرالے تھے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے کچھ نہ کچھ اثر جنوبی امریکہ کے فکشن نگاروں سے قبول کیا لیکن ان کے افسانوں کا ماحول یا فضا وہی ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔

جس کا ہو سراپا آپ محمود
کیا شعر میں کیجے اس کو محدود

اس جگہ محمد سلیم الرحمٰن کی اشارہ اپنے دوست کی نثر نگاری سے متعلق ہے۔ نثر سیدھی سادی ہے۔ مفہوم ادا کرنے کے لیے موزوں ہے۔ اصل میں پہلے گیلانی انگریزی میں لکھتے تھے۔ اردو کی طرف متوجہ ہوئے تو انھیں بیانیہ سے نباہ کرنے میں کچھ دشواری ہوئی۔ لیکن جلد ہی سادگی پر مبنی اپنا اسلوب وضع کرنے میں کام یاب ہوگئے۔

گو پیشِ نگاہ نیش یا نوش
تھا جُود و کرم سدا سے مقصود

یہاں اپنے دونوں دوستوں کے مزاج سے تعارف کرایا گیا ہے۔ دونوں کے مزاج میں سخاوت بہت تھی۔ کبھی خفا بھی ہوتے تو تھوڑی دیر کے لیے۔ دونوں کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے۔ دونوں کو بڑے بڑے منصوبے سوجھتے تھے۔ بعض کی تکمیل ان کی بساط سے باہر سہی لیکن اپنے فیصلوں پر ڈٹے رہتے تھے۔ نفع نقصان کی پروانہ تھی۔

ہر شوقِ سفر تھا ماورائی
نہ خوفِ زیاں نہ مستیِ سُود

یہاں پر زندگی جینے کا چلن بتایا گیا ہے۔ جن معمولی باتوں اور منصوبہ بندیوں میں اہلِ دنیا گھرے رہتے ہیں انک کی سوچ ان ادنی باتوں سے ماورا تھی۔ اسے آپ تخیل کی زرخیزی بھی کہہ سکتے ہیں یا حقائق کو نظر انداز کرتے رہنے کی عادت۔ گیلانی صاحب کو برصغیر کی کلاسیکی موسیقی کی بھی خاصی سمجھ تھی۔

وہ لحن کہ روشنی کی رَو تھا
جو یاد ہے سو ہے جاوداں رُود

گفتگو کرنے اور قصے سنانے یا گھڑنے میں دونوں ماہر تھے۔ جب ان کی طبعیت سخن آرائی پر مائل ہوتی تو یہی جی چاہتا تھا کہ وہ کہے جائیں اور ہم سنے جائیں۔

ذوالفقار تابش کے لیے نظم

میں تو بہت شریف تھا، شاعری کر گئی خراب
نشے کی لہر تھا مرے حق میں ہر ایک شعر ناب
نقش و نگار یار سے میرے ورق تھے سیل رنگ
ہاتھ میں روزگار کی اشکوں سے تر بتر کتاب
قسطوں میں تھی بٹی ہوئی ساری اُدھار زندگی
کتنی ملی، نہیں ملی، اس کا کریں گے کیا حساب
تابش آفتاب سے روشن ہوئے ہیں جا بجا
تشنگی فراق کے سیکڑوں بے کراں سراب(۸)

مطلع سے ہی باہمی محبت کا پتا چل رہا ہے۔ اس میں بے تکلفی کا انداز ہے۔ یہ کیفیت ایک دو دن میں نہیں پیدا ہو گئی۔ چھ دہائیاں لگ گئیں۔ تعلق بھی بادۂ کہنہ کی طرح ہوتا ہے۔ جتنا پرانا اتنا اچھا، اتنا پائیدار۔ باہمی اصالت کی علامت۔ اس میں ہم شوق ہونا بھی بڑی وجہ ہوتا ہے۔ شاعری، نثر، ادارت کلاسیکی متون کے ملخص تیار کرنا دونوں شخصیات کے مشترک شوق ہیں۔ اس کے علاوہ خطاطی، مصوری، طب ذوالفقار تابش کے الگ منطقے ہیں۔ ذوالفقار تابش کی شاعری کا مجموعہ "در نیم وا" کے نام سے حال ہی میں القا، ریڈنگز، لاہور سے چھپا ہے۔ اس مجموعے کی شاعری معاصر شعری منظر میں حسن اور خیر کی دنیا ہے۔ مطلع میں شاعری اور شاعری سے ذوالفقار تابش کی محبت کو بتایا گیا ہے۔ اس اطلاع میں شعر تو بنا ہے خبر نہیں:

میں تو بہت شریف تھا، شاعری کر گئی خراب
نشے کی لہر تھا میرے حق میں ہر ایک شعر ناب

شاعری اور باقی علوم کا فرق یہ ہوتا ہے کہ شاعری کا شریف وہ شریف نہیں ہوتا جس کے معانی لغت میں لکھے ملتے ہیں۔ نہ شاعری میں خراب مستعمل معنی میں خراب ہوتا ہے۔ یہاں خراب ٹھیک ہو سکتا ہے اور شریف ٹیڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے لوگ شاعری میں اس قدر دلچسپی نہیں لیتے جس قدر فکشن میں درک رکھتے ہیں۔ غور نہیں کرتے۔ اگر شاعری کے اسرار انسان پر کھل جائیں تو یہ حسن کی وہ دنیا ہے جس سے باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔

ذوالفقار تابش نے اپنی زندگی شاعری کے نام کر دی۔ اس کے لیے شعر کی حیثیت نشے کی لہر کی سی رہی۔ جس طرح نشے میں مبتلا لوگ نشے کے حصول اور سرور پر زندگی وار دیتے ہیں یہی صورت یہاں ہے۔ خالص شعر پر سر دھنتے رہنا۔ خیال کی جنت میں آسودہ۔ مادیت سے دور۔ اپنی بنائی تصویروں اور اپنے ڈھالے مصرعوں کی آرائش میں مگن رہنا۔ مجنوں کا بڑا وظیفہ جنوں کی حفاظت کے سوا کیا ہے۔ شاعری

ذوالفقار تابش کا نشہ ہے اور اس کی لہر پر وہ تن وار چکا ہے۔ کیسی اچھی قسمت پائی ہے۔ اپنے شوق کی زندگی گزارنا اور اس پر کسی طرح کا کوئی سمجھوتا نہ کرنا:

نقش و نگار یار سے میرے ورق تھے سیلِ رنگ
ہاتھ میں روزگار کی اشکوں سے تر بتر کتاب

اس جگہ محمد سلیم الرحمٰن نے اپنے حبیب لبیب کے دو مشغلے پروئے ہیں۔ مصوری اور ملازمت۔ یار کا نقش کاغذ پر رنگوں کا سیلاب لا سکتا ہے۔ ایم ایف حسین، رام چندرن، شاکر علی، عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویریں دیکھیں۔ ذوالفقار تابش کے بنائے ہوئے کتابوں کے سرورق دیکھیں۔ (شمس الرحمٰن فاروقی کے معروف ناول کئی چاند تھے سرِ آسماں کا سرورق دیکھیں ذوالفقار تابش کا بنایا ہوا ہے) تصویریں خاموش شعر نظر آئیں گے۔ جس ہاتھ سے محبوب کا سراپا بنایا جائے اس ہاتھ پر رب راضی ہوتا ہے۔ رنگوں کا میلہ سالگ جاتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں اشکوں سے تر بتر کتاب سے رسالہ "کتاب" مراد ہے جسے نیشنل بک کونسل (موجودہ نیشنل بک فاؤنڈیشن) چھاپتی تھی۔ ذوالفقار تابش اس ادارے سے منسلک تھے۔ روزگار کی آسائشیں اور کلفتیں برداشت کیں اور زندگی کرتے رہے۔ کیسا خوبصورت ہاتھ ہے جس میں کتاب ہے:

قسطوں میں تھی بٹی ہوئی ساری ادھار زندگی
کتنی ملی ، نہیں ملی، اس کا کریں گے کیا حساب

یہاں کتنا ہے غم۔ دُکھی زندگی کی بپتا۔ اول تو زندگی بذاتِ خود ادھار کا مال ہے۔ اس پر اتنی مشکلیں۔ قسطوں پر قسطیں۔ رڈے پر رڈا۔ اس پر بے اختیاری۔ جو پل آیا گزار دیا۔ ادھر زندگی کا چراغ گل ہو بھی جائے تو درد کی قسط واجب الادا رہتی ہے۔ آج کا دن گزر گیا۔ کل کیسے گزرے گا۔ اس بات کا پتا نہیں۔ کتنی یافت کتنا خسارہ۔ جب بیتی اونے پونے جا رہی ہو تو کچھ یاد نہیں رہتا۔ حساب تو اعصاب کی فعالیت کی علامت ہے۔ یہاں زندگی قسطوں میں گزر رہی ہے۔ جبر کے حصار میں۔ قطرہ قطرہ:

تابش آفتاب سے روشن ہوئے ہیں جا بجا
تشنگی فراق کے سیکڑوں بے کراں سراب

مقطع میں دوست کا نام آگیا۔ غم خوشی میں بدل گئے۔ ایک طرف فراق۔ ساتھ میں تشنگی فراق کی ترکیب۔ اس پر سیکڑوں بے کراں سرابوں کا سامنا۔ جدائیوں کی اس فصل کے کاٹنے میں تابش آفتاب کی ضو اندھیرے میں روشنی کی طرح رہی۔ یا اندھیرے میں اندھیرا گھل گیا۔ کچھ پتا نہیں۔ دوست دوست کا آئینہ ہوتا ہے۔ اندر کی خالی جگہوں کو پُر کرنے کا وسیلہ۔ اس بات کا احساس یہاں موجود ہے۔ دوست راحت ہے۔ غم ہے یا کیا ہے۔ اس کے ہونے میں ان سب کیفیتوں کے ہونے کا سراغ ہوتا ہے۔ ذوالفقار تابش کو

جس سلیقے اور حسن کے ساتھ محمد سلیم الرحمٰن نے لکھا ہے ایسا تعلق نصیب والوں کے حصے میں آتا ہے۔ چار شعروں میں زندگی نامہ مرتب کرنا ہر شاعر کا حصہ نہیں۔ محمد سلیم الرحمٰن کی ذوالفقار تابش کے لیے یہ نظم ایسے پانی کی طرح جسے جس رنگ میں ڈالیں اس کا وہی رنگ بن جاتا ہے۔ زندگی اگر رنگوں کا کھیل ہے تو ذوالفقار تابش رنگوں کی نفسیات کا رازداں۔

خورشید رضوی کے لیے نظم

خورشید رضوی سے کون واقف نہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے۔ وجہ یہ کہ انھوں نے کبھی اپنی واقفیت کرانے کے لیے خود کو پیش نہیں کیا۔ اپنے آپ سے رابطہ رکھا۔ اپنی تنہائی کی حفاظت کی۔ اپنے آپ سے مکالمہ کیا۔ اور ذات کی سان پر تپا کر خود کو خود جیسا کر لیا۔ آوازوں کے شور میں خاموشی کی مہین چادر اوڑھ لی۔ جُبوں، قُبوں اور دستاروں کے بازار میں خرقہ پوشی کو شعار کیا۔ شاعری، کلاسیکی متون، عربی ادب کی تاریخ، تنقید، بچوں کے ادب اور تدریس میں خود کو گم رکھا۔ اس لگن نے ان کو اتنا سنہرا کر دیا ہے کہ اب کسی عارضی وسیلے کی، کسی کُرسی کی، کسی دستار کی ضرورت رہی نہیں۔ اُن کی تنہائی محفل میں بدل گئی ہے جو اشعار کی صورت کئی درد نصیبوں کا آسرا ہے۔ آوازوں کی دنیا میں اُن کا شعر پناہ کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ ایک سکون جس پر عطا کا پہرہ ہو۔ کبھی خیال آتا ہے کہ خدا کے سنبھالے ہوئے لوگ کیسے ہوتے ہیں تو دھیان از خود خورشیدِ نو بہار کی طرف چلا جاتا ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن کی "نظمیں" میں ایک نظم خورشید رضوی کے لیے بھی ہے:

پہنے تھے گو فریب نے سو رنگ کے لباس
بدلی نہ جا سکی قد و قامت کی وہ اساس
شیر و شکر معانی سے لفظوں کا اختلاط
یہ قافیوں کا لمس ، ردیفوں کا وہ مساس
بے منزلِ مراد سفر خود کو گم کیے
تنہا مسافتیں ہوں جہاں سر بسر سپاس
خورشید نو بہار میں کیا کیا تھیں رونقیں
دل میں کوئی کسک تھی جو کرتی رہی نراس(۹)

اس نظم کا مطلع شخصیت کے مزاج کو متعین کر رہا ہے۔ پتا چل رہا ہے کہ شعبدہ باز دنیا میں کسی اصیل روح کا ذکر ہے۔ فریب جتنے مرضی سوانگ رچا لے اصیل کی جگہ نہیں لے سکتا۔ قد و قامت جو ہاتف عطا کر دے اُسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اپنے ناموں سے کھیلنے والے نوجوان اناڑیوں کو یہ خبر ہی نہیں کہ چار دن کی چاندنی پر ابدی سکون کو فدا کرنا دانائی نہیں۔ کوئی جتنا مرضی خود سے بے خود ہو لے اگر خدائے زندہ نے اُسے زندہ نہیں بنایا یعنی اُس میں ہنر کا بیج نہیں رکھا تو فریب کے سو رنگ لباس پہننے کا کچھ فائدہ نہیں۔

قد و قامت کو کاٹ کر اپنے برابر نہیں کیا جا سکتا۔ فطرت کی حنا بندی وقتی آرائش سے دیر پا ہوتی ہے۔ عزت اور ذلت کے فیصلے اس دنیا سے کہیں اُس طرف ہوتے ہیں۔ اُس کی دی ہوئی عزت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ فنا نہیں۔ زوال نہیں۔ حرماں نصیبی اس کا مقدر نہیں:

شیر و شکر معانی سے لفظوں کا اختلاط
یہ قافیوں کا لمس ، ردیفوں کا وہ مساس

اس جگہ خورشید رضوی کے شاعرانہ عمل کو دکھایا گیا ہے۔ لفظوں میں معانی ایسے ہوتے ہیں جیسے دودھ میں شکر۔ ایسا نہیں کہ لفظ اور معانی دست و گریباں ہوں۔ جس طرح دودھ میں ایک دفعہ شکر مل جائے تو الگ نہیں کی جا سکتی اسی طرح سلیقے سے لفظ اور معنی کا اختلاط ہو جائے تو دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ قافیہ اور ردیف ایسے نہیں لایا جاتا کہ قافیہ برائے قافیہ اور ردیف برائے ردیف۔ اس امانت کو، جو تخلیق کی صورت خدا نے عطا کی ہے، سینچا جاتا ہے۔ پکایا جاتا ہے۔ قافیے ردیف کی جگہیں دیر تک من میں بسا لی جاتی ہیں۔ بدل بدل کر دیکھا جاتا ہے۔ اس کے لمس کو مشامِ جاں میں سمایا جاتا ہے۔ ردیف کے مساس سے ہنر کی آبیاری کی جاتی ہے۔ تب جا کر فصل پکتی ہے۔ ایسی فصل جس کی بالیوں میں زر ہوتا ہے۔ ایسی کھیتی جو انسان کو آیہ کائنات کا معنی دیریاب بناتی ہے:

بے منزل مراد سفر خود کو گم کیے
تنہا مسافتیں ہوں جہاں سر بسر سپاس

جن مسافروں کو سفر سے عشق ہوتا ہے ان کے نزدیک منزل اتنے معانی نہیں رکھتی۔ وہ بس چلتے رہتے ہیں۔ ان کی وفاداری راستے سے زیادہ ہوتی ہے۔ شاعر کا سفر منزل کا سفر نہیں ہوتا۔ وہ کہیں راستے کی دھول بھی بن جائے تو آنکھ کا سرما سمجھتا ہے۔ خورشید رضوی کا شعری سفر اُس انسان کا شعری سفر ہے جس کے مقدر میں مسافت لکھ دی گئی ہے۔ ایسی مسافت جسے احسان سمجھ کر اپنا لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے زاری نہیں آتی۔ مسافر کا مسافت سے جی لگا رہتا ہے۔ تھک کر بیٹھنے نہیں دیتی۔ جب منزل کا تصور ذہن میں ہو اور وہ نہ ملے تو کئی مسافر اکتا جاتے ہیں۔ خورشید رضوی خیال کا مسافر ہے اور خیال سے بڑی اور کوئی طاقت نہیں۔ دھیان اس میں راستہ ہوتا ہے۔ صبر اس کی ڈھارس ہوتی ہے۔ شکر اس کا شعار ہوتا ہے۔ اس شعر میں معنوی سطح پر خورشید رضوی کے کلام کو محسوس کیا گیا ہے۔ احساس کا یہ سفر شاعر کی شعری اقلیم میں داخل ہونے کا بڑا وسیلہ ہے۔ خورشید رضوی کی زندگی سرابوں میں صدف تلاش کرتے گزری ہے۔ وہ امکان کے مسافر ہیں اور امکان کے مسافروں کو رائگانی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ یہ سفر رُکا نہیں، جاری ہے۔ اُمید کی طرح:

خورشید نوبہار میں کیا کیا تھیں رونقیں
دل میں کوئی کسک تھی جو کرتی رہی نراس

تخاطب میں اپنائیت اور خراج دیکھیں۔ خورشید رضوی کے لیے خورشید نوبہار کی ترکیب بہار کے سورج کی طرح تسلی دے رہی ہے۔ دل خوشی سے بھرا جا رہا ہے۔ دل میں رونق اور میلے کا سماں ہے۔ ساتھ ہی ایک چبھن، ایک پھانس جو کبھی کبھی ناامید بھی کرتی ہے کہ ایسے لوگوں کے نصیب میں اتنا اکلاپا۔ آخر کیوں۔ ایسی چپ۔ بیٹھے غم سے خوشی اور خوشی سے غم کو دھوتے رہنا۔ اگرچہ اس یاس پر صاحب یاس کو کوئی تاسف نہیں مگر پھر بھی کبھی کبھی دُکھ کی ٹیس سی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو۔ اس شاعر نے خود سے مکالمہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تالیفات ساری اطراف سے متوکل نظر آتی ہیں۔ اس صابر انسان پر محمد سلیم الرحمٰن کی یہ نظم آواز پر خاموشی کی فتح کا گیت ہے جس میں بے سہاروں اور اکیلے لوگوں کی بہت جگہ ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) محمد سلیم الرحمٰن، نظمیں (باردوم)، (لاہور: قوسین، ۲۰۱۹ء)، ۲۷۸۔

(۲) ناصر کاظمی، کلیاتِ ناصر کاظمی، مرتبین: باصر سلطان کاظمی و حسن سلطان کاظمی، (لاہور: القا پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ۲۸۳۔

(۳) محمد سلیم الرحمٰن، نظمیں (باردوم)، ۲۷۹۔

(۴) ایضاً، ۲۸۰۔

(۵) ایضاً، ۲۸۱۔

(۶) ادب لطیف (سالنامہ)، لاہور: ۱۹۶۳ء، ۵۵۔

(۷) محمد سلیم الرحمٰن، نظمیں (باردوم)، ۲۸۲۔

(۸) ایضاً، ۲۸۳۔

(۹) ایضاً، ۲۸۴۔

❖❖❖